خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

ترتیب

اشہد ان لا الٰہ

میری نوا کا ثبات ، اشہد ان لا الٰہ
قلب و نظر کی حیات ، اشہد ان لا الٰہ

عالمِ نو ہے مگر آج بھی ہوں نغمہ زن
توڑ کے لات و منات ، اشہد ان لا الٰہ

شوکت فغفور و کے ، سلطنتِ روم و رے
موت ہے اِس کی برات ، اشہد ان لا الٰہ

تو ہے مسلماں تو ہیں ایک ہی دریا کی موج
دجلہ و نیل و فرات ، اشہد ان لا الٰہ

پھر وہ اذانِ سحر ، ڈھونڈ رہی ہے جسے
تیرے شبستاں کی رات ، اشہد ان لا الٰہ

علم و ہنر کا فسوں ، عشق کا زورِ جنوں
بندۂ حق کی نجات ، اشہد ان لا الٰہ

درد کا درماں بھی یہ ، عشرتِ دوراں بھی یہ
تلخیِ غم میں نبات ، اشہد ان لا الٰہ

خیال وخامہ

یہ عالم ، یہ ہنگامۂ رفت و بود　　نہیں اِس کے پیکر میں اِس کا وجود

سحر شب گزیدہ اجالوں کی جنگ　　شب اپنی سیاہی میں آلودہ چنگ

یہ مہ تیرہ رو ، ظلمتوں کا اسیر　　فلک اِس کی ظلمت سے صورت پزیر

افق سے نکلتا ہوا آفتاب　　اندھیروں کا چہرے پہ لے کر نقاب

بجھے بزمِ انجم کے سارے چراغ　　نہ مطرب، نہ ساقی، نہ مے، نے ایاغ

نہ قوسِ قزح پردۂ رنگ میں　　نہ رنگِ شفق اپنے آہنگ میں

سیہ پوش بجلی کا مرقد تمام
ہے ماتم میں چرخِ زبرجد تمام

اسی طرح آزردہ ، افسردہ رو — زمیں پر بھی دیوار و در ، کاخ و کو
یہ موجیں سفینے الٹتی ہوئی — بہت دور جا کر پلٹتی ہوئی
اچھلتی ، ابھرتی ، نکلتی ہوئی — یہ ہر لحظہ پہلو بدلتی ہوئی
کبھی اپنے دامن سے گرمِ ستیز — کبھی تند جولاں ، کبھی نغمہ ریز
یہ سب تہ بہ تہ ظلمتوں کا وجود — نہیں ان کے بربط میں کوئی سرود
شکستہ نفس بحرِ خاموش میں — سرافگندہ ساحل کی آغوش میں
جہاں بھر میں ہر چیز کھوئی ہوئی — غم آغوش میں لے کے سوئی ہوئی
زمیں آسماں کی صدائیں خموش — زمیں سے فلک تک فضائیں خموش
نہ صحرا میں وہ آہووں کا خرام — نہ باغوں میں سرو و سمن ہم کلام
نہ پھولوں میں نغمہ سرا عندلیب — نہ بادِ صبا سے چمن خوش نصیب
نہ آہو بیاباں میں شیروں کے صید — نہ کنجشک شاہیں کے پنجوں میں قید
نہ سبزہ ، نہ شبنم ، نہ صبحِ بہار — خرابہ فقط وادی و کوہ سار

یہ عالم پریشاں ہے، دل گیر ہے
جہاں دیکھیے غم کی تصویر ہے

مگر اس میں روشن یہ اک رہ گزر
اِنھی ظلمتوں میں مری ہم سفر

درخشاں یہ اِس کے نشیب و فراز
نہاں جن کے سینوں میں فطرت کے راز

تڑپتا ہے پہلو میں دل ناصبور
مسافر ابھی اپنی منزل سے دور

مری ناقہ دریا کی صورت رواں
یہ صحرا میں صحرا کی صورت رواں

دما دم رواں ، یہ دما دم قریب
اِسی طرح منزل سے پیہم قریب

وہ بستی کے دیوار و در سامنے
وہ مٹی کے ، پتھر کے گھر سامنے

وہی راستوں پر ہجومِ نخیل
فضا میں وہی نغمۂ جبرئیل

مرے جیب ودامن پہ تاروں کی دھول
یہ اڑتی ہوئی رہ گزاروں کی دھول

یہ رختِ سفر آسماں کے لیے
یہ اک بدرقہ لامکاں کے لیے

یہ بستی ، یہ سارے جہانوں کا دل
زمینوں کا دل ، آسمانوں کا دل

وہی جس سے قلب ونظر میں سرور
وہی جس میں ہر لحظہ شانِ حضور

مری آرزووں کا حاصل وہی
مری جستجوؤں کی منزل وہی

مری لیلیٰ جاں کا محمل وہی مری کشتیِ دل کا ساحل وہی
وہی قبلۂ اہلِ صدق و یقیں ہوئی جس کے جلووں سے روشن زمیں

مہ و مہر و انجم کا مسکن ہے یہ
ادب سے، پیمبر کا مدفن ہے یہ

اسی میں وہ راہب، وہ گردوں وقار ہوئے روم و تبریز کے شہر یار
وہی پادشاہوں میں تنہا فقیر نہ تھی جن کی عالم میں کوئی نظیر
وہ صحبت نشینانِ ختم الرسل وہ تیرہ شبوں میں دلیلِ سبل
وہی جن سے ہر شاخِ ہستی میں نم ہر اک مزرعِ دل پہ ابرِ کرم
وہ دنیا میں انساں کی حدِ کمال زمیں پر خدا کا جلال و جمال
یگانہ تھے اپنی روایات میں جہاں سے الگ اپنی ہر بات میں
کبھی نرم تھے پرنیاں کی طرح کبھی گرم تیغ و سناں کی طرح
کبھی خلوتوں میں سراپا نیاز جبینوں سے روشن دلوں کا گداز
کبھی اہلِ باطل پہ برقِ تپاں کہ ہوں خار و خس جس سے کوہِ گراں
وہ علم و ہدایت میں 'ہل من مزید' حمیت، حمایت میں فردِ فرید

نمازوں میں وہ چشمِ پرنم تمام　　حضورِ رسالت میں شبنم تمام

مگر استقامت میں چرخِ بریں　　پہاڑوں سے محکم تھا اُن کا یقیں

وہ شب خیزیوں میں تھی راحت جنھیں　　وہ سجدوں میں ملتی تھی لذت جنھیں

وہی خندۂ دل نشیں کا نمک　　وہ ہستی کا جوہر، زمیں کا نمک

کہ نکلے تو گویا کہ اسپند تھے　　اٹھے تو ہمالہ تھے، الوند تھے

شب و روز حق کے لیے بے قرار　　وہ راتوں کے راہب، دنوں کے سوار

وہ حق کی، صداقت کی تصویر تھے
وہ انساں کے خوابوں کی تعبیر تھے

جہاں سے اس طرح اٹھے یہ اہلِ مے خانہ
کہ بحر و بر میں عزازیل نے جلائے چراغ
فلک کا نوحہ زمیں کے حدود میں پہنچا
کہ کھو دیا ہے ستاروں نے منزلوں کا سراغ

ترے جہاں میں صداقت کی آبرو کے لیے

نکل پڑے تھے تو ٹھیری تھی گردشِ افلاک

مثالِ شعلہ نگاہ و دل و زبان و وجود

فراعنہ کی رعونت فقط خس و خاشاک

یہ عالم ، یہ ہنگامۂ خیر و شر   یہ عالم ، یہ نیرنگِ شام و سحر

اِسے درپئے کیف وکم چھوڑ کر   بس اک رہ گزارِ امم چھوڑ کر

تمدن کو مشغولِ تن چھوڑ کر   ہر اک شے کو رہنِ بدن چھوڑ کر

اِسی شہرِ خوباں میں حاضر ہوں میں

اِس اقلیمِ یزداں میں حاضر ہوں میں

افق پر یہ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر   نہیں کچھ بھی دن ڈوب جانے میں دیر

شفق اِس طرح ابر پاروں میں بند   کہ ہوں رنگ جیسے شراروں میں بند

یہ کوہِ اضم پر زرافشاں فلک   یہ ہر سمت رنگِ حنا کی جھلک

یہ ٹیلے ، یہ وادی ، یہ نور و ظہور　　ہر اک نخلِ طیبہ ہے اک نخلِ طور

ہم آہنگ و ہم رنگ دید و شنید　　کہ رخشِ تمنا بہ منزل رسید

وہی شہرِ خوباں مرے سامنے

وہ اقلیمِ یزداں مرے سامنے

یہ جنبش ہے کیا پردۂ خواب میں　　وہ فاروق مسجد کی محراب میں

وہی فاتحِ مصر و شام و عراق　　وہ عالم پہ اک چرخِ نیلی رواق

سیاست ، وہ جس کی عبادت تمام　　زمیں پر خدا کی عدالت تمام

فقط اک غلام اُس کی شوکت تمام　　یہی کچھ تھا سامانِ راحت تمام

وہ اک بوریا جس کا تخت و سریر　　وہ سلطاں ، مگر ایک مردِ فقیر

کبھی خوانِ نعمت پہ نانِ جویں　　کبھی ریگِ صحرا پہ راحت نشیں

پرانا قمیص اک وہی زیبِ تن　　مگر پادشاہوں سے گرمِ سخن

نہ لشکر ، نہ خدام و خرگاہ و فر　　وہ شام و فلسطیں میں اُس کا سفر

شب آلود صبحوں میں گرمِ فغاں　　گراں اُس پہ راتوں میں خوابِ گراں

دنوں میں بھی آرام و راحت کہاں　　اگر لوگ سوتے ہوں محرومِ ناں

نفس در نفس لامکاں ہم نوا وہ اقلیمِ یزداں کا فرماں روا

وہی آرزوے پیمبر وہی

مری جستجوؤں کا محور وہی

میں اٹھا کہ جلووں سے دامن بھروں بڑھوں، پاؤں لوں، دل کی باتیں کروں

مژہ اک ذرا اس میں برہم ہوئی ہر اک چیز آمادۂ رم ہوئی

افق تا افق ظلمتوں کا ظہور چھنا آسمانوں سے صبحوں کا نور

نہ وہ شہرِ خوباں، نہ وہ روز و شب پریشاں نگاہوں میں شوقِ طلب

فضا چھپ گئی پردۂ خواب میں

بس اک لَو سی باقی ہے محراب میں

اسی لو کی صدیوں رہی ہم سفر وہ امت کہ تھی کاروانِ سحر

وہی جس سے دنیا میں نورِ حیات وہی جس سے پیدا سرورِ حیات

وہ دی جس نے اقوام کو روشنی تمدن دیا اُن کو، تہذیب دی

خداوندِ عالم پہ ایماں دیا خداؤں کو رخصت کا فرماں دیا

کیا اُن کو توحید میں گرم جوش ہر آئینہ حق کے لیے سرفروش

وہ مے دی کہ جام و سبو اور تھے — وہ لے دی کہ ساز و گلو اور تھے

شرر تھا تو روحِ شرر بخش دی — سحر کو اذانِ سحر بخش دی

انھیں اپنا سوزِ دروں بھی دیا — خرد دی ، کمالِ جنوں بھی دیا

دیا اُن کو علم و ہنر کا شعور — حقیقت کے نفع و ضرر کا شعور

ہر آشفتہ خاطر کو دل کا حضور — ہر آزردہَ ناں کو فقرِ غیور

نگاہوں کو پاکیزگی کا جمال — وہ حسنِ طبیعت ، وہ حسنِ خیال

ہوئی جس سے تطہیرِ روح و بدن — مسلماں ہوئے علم وتہذیب وفن

اسے آج دیکھیں تو لگتا ہے خواب — کہ ہیں باغ صحرا تو دریا سراب

تلاطم ، نہ گوہر ، نہ موجِ ہوا — نہ پھولوں کی نکہت ، نہ حسنِ ادا

یہ امت ہے اب عہدِ رفتہ کی یاد — سرِ شام صبحِ گزشتہ کی یاد

ہے باقی اگر کچھ تو باقی ہے نام

زمیں اس کے جلووں سے فارغ تمام

یہ دور اب ہے اولادِ یافث* کا دور — اِس امت کی تقویمِ ہستی ہے اور

---

*روس وچین اور تمام مغربی اقوام کے ابوالآبا اور نوح علیہ السلام کے بیٹے کا نام۔ یاجوج وماجوج اسی کی

کہ ہے روح اِس میں بدن سے الگ
بدن جس طرح پیرہن سے الگ

ابد اِس میں دنیا کی موت و حیات
خدا خود یہی عالمِ شش جہات

نہیں اِس کے اربابِ دانش کو راس
اگر علم و دانش ہو عقبیٰ شناس

رگ و پے میں اترے ہیں اِس کی یہود
وہ صدیوں سے جن کی معیشت ہے سود

بروں جس سے محکم، دروں بے ثبات
دگرگوں ہیں انساں کی ذات وصفات

حیا، جس طرف دیکھیے، سرنگوں
وفا اِس کے شہروں میں خوار و زبوں

نہ رشتوں کی پروا، نہ جذبوں کا پاس
زمیں بھی اداس، آسماں بھی اداس

اسی شر میں پیدا ہے لیکن وہ خیر
کہ منکر ہیں جس کے نہ اپنے نہ غیر

یہ انساں کی عزت، یہ اُس کا شعور
یہ جمہور فرماں روا نزد و دور

یہ اوہام سے علم و فن کا گریز
یہ دنیا میں اِس کا سفر تیز تیز

نئی حیرت افزا مشینوں کے ساتھ
تمدن کے تازہ قرینوں کے ساتھ

اولاد تھے۔ان کے خروج کو قرآن مجید اور دوسرے الہامی صحیفوں میں قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

نیا ایک در روز ہوتا ہے باز　　عیاں اس کے معمل میں فطرت کے راز

جہاں آفریں ذوق و شوق و خیال　　زمیں پر بہشتِ بریں کا جمال

یہ خیر اِس سے لے کر بہ صد احترام

ہمیں اِس کو دینا ہے دیں کا پیام

وہ دیں، عقل و فطرت پہ جس کی اساس　　وہ دیں، روح جس کی خدا کا سپاس

وہی امتحاں جس میں موت و حیات　　عمل پر ہے جس میں مدارِ نجات

خدا جس میں یکتا، خدائی میں فرد　　نبی اُس کے بندے، بھلائی میں فرد

دوئی جس میں حق کے لیے ناپسند　　وہ دنیا میں توحید سے ارجمند

وہی جس میں راحت رکوع و سجود　　دلوں کی سکینت صلوٰۃ و درود

بنی نوعِ انساں کی زینت حیا　　وہ دیں، جس میں رشتوں کی عظمت وفا

وہ دیں، جس میں برتر ہے کوئی تو نیک　　کہ خِلقت میں اولادِ آدم ہے ایک

محافظ ہے ناموسِ زن کا، وہ دیں　　نہیں جس میں ڈر برہمن کا، وہ دیں

غلاموں کو جس نے چھڑایا، وہ دیں　　اُنھیں پستیوں سے اٹھایا، وہ دیں

یتیموں کا غم جس نے کھایا، وہ دیں　　ضعیفوں کو جس نے بڑھایا، وہ دیں

نہیں جس میں کوئی معیشت کا روگ　　محاصل سے آزاد ہیں جس کے لوگ

سیاست میں جمہور فرماں روا　　عدالت میں یکساں ہیں شاہ و گدا

برائی بھلائی سے یکسر جدا　　زیادہ نہ کم مجرموں کی سزا

کوئی اِس میں دیکھے عبادت کی شان　　عبادت میں عجز و محبت کی شان

غریبی سے پیدا امیری کی شان　　ہو شاہی تو اُس میں فقیری کی شان

وہ دیں، صبر و اعراض جس کا مزاج　　تشدد ، نہ ہنگامہ و احتجاج

وہ دیں، جس میں دعوت جہادِ کبیر　　وہ دیں، جس میں حکمت ہے خیرِ کثیر

وہ دیں، جس میں امن واماں لازوال　　وہ دیں، جس میں مذموم جنگ وجدال

سیاست ، نہ مذہب ، نہ مال و منال　　فقط ظلم و عدوان وجہِ قتال

وہی ترجماں جس کا زندہ کلام　　وہ دیں ، جس کو بخشا خدا نے دوام

اُٹھیں ، اِس کو ہر سو ہویدا کریں

زمانے کو پھر اِس کا شیدا کریں

نوا سنج وادی میں مرغِ سحر　　خرد اُس کے نغموں سے روشن بصر

افق پر وہی جلوۂ آفتاب　　نہیں ظلمتوں میں ٹھہرنے کی تاب

یہ اٹھتی ہوئی بدلیاں ہر طرف یہ اک نور کا طَیلساں ہر طرف

فضا رنگ افشاں ، ہوا عطر بیز ہر اندوہِ ہستی سے اس کو گریز

پرندوں کے نغمے ، یہ رنگِ سخن مرے بربطِ دل میں پوشیدہ فن

مرے لفظ و معنی میں پنہاں گداز وہ آتش بہ دل ، دل بہ داماں گداز

مری جنبشِ لب پہ رقصاں گداز مرے دیدۂ تر میں لرزاں گداز

وہ نغمہ ، وہ روح و بدن کی تپش وہ روحِ تمنا ، وہ دل کی خلش

وہ برہا ، نہاں جس میں سوزِ جگر ہر آہنگ شعلہ ، ہر اک لے شرر

وہ گریہ کہ ہر لحظ آتش نفس وہ نالہ کہ ہر لمحہ افلاک رس

ہوا اِس کی مضراب سے نغمہ زن مری آرزووں کا سازِ کہن

مرا دل ، مری خاک بیدار تر مری چشمِ نم ناک بیدار تر

نئے آسمانوں میں گرمِ سفر مری جستجووں کا ذوقِ نظر

نمایاں ہے پھر مرجِ شش جہات تخیل کے پردوں پہ رقصاں حیات

نظر اٹھ گئی ناگہاں سامنے کہ منظر تھا اک دل ستاں سامنے

یہ منظر ، یہ اک کیمیاے فتوح کہ ہو جس سے مٹی میں آباد روح

زمستاں ہو صبحِ بہاراں تمام بیاباں ہو صحنِ گلستاں تمام

یہ منظر، یہ فردوسِ قلب و نظر یہ اک عالمِ نو، جہانِ دگر

اِدھر عالمِ وجد میں زندہ رود* نوا ایک شعلہ، فغاں موجِ دود

نگاہوں میں ہر لحظہ اک رستخیز ہر اک موج ساحل سے گرمِ ستیز

نفس پارہ پارہ، نظر چاک چاک تلاطم میں ہے قعرِ دریا کی خاک

زباں لفظ و معنی کی اک کہکشاں بیاں لعل و گوہر کی جوے رواں

اُدھر بزمِ شبلی میں صحبت نشیں دلآویز، پر سوز، روشن جبیں

دبستانِ شبلی کے خیر الکرام فراہی، ابو الاعلیٰ و بو الکلام

ذرا دور گوشے میں خلوت گزیں اسی علم و حکمت کا حصنِ حصیں

فراہی کے فکر و نظر کا امیں**

وہ بزمِ علم میں اربابِ جستجو کا امام

کھلے ہیں جس کے تدبر سے لامکاں کے رموز

---

* علامہ محمد اقبال کا نام جو انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''جاوید نامہ'' میں خود اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

** استاذ امام امین احسن اصلاحی، صاحب ''تدبر قرآن''۔

وہ اِس زمانے میں اگلوں کی رفعتوں کا مثیل
وہ اُس زمانے کی کھوئی ہوئی نوا کا بروز

عجم میں قافلۂ شوق کی متاعِ جلیل
مرے زمانے میں عقلِ گریز پا کا حریف
مری حیاتِ مسلسل کی دل نشیں تعبیر
گواہ جس کی صداقت پہ خود قلم کی صریف

بہت قدیم قبائل کے شاعروں کا خیال
روایتوں کی حقیقت، حکایتوں کا وجود
نخیلِ کہنہ کے سایے میں ایک مردِ فقیر
نئے زمانوں کی جس کے نفس نفس سے نمود

وہ قافلوں کا تواتر تھا پھر بھی تنہا تھا
وہ اپنے ذرّۂ ہستی میں ایک صحرا تھا

مرے دل کی امید گویا ہوئی — یہ بزمِ صنادید گویا ہوئی
کہ ہے اب یہ تیری نوا سینہ تاب — اٹھاتی ہے قلب و نظر کا حجاب
رگِ دل سے پیدا، رگِ دل کا نیش — ہر اندازۂ تار سے بیش بیش
مسلماں کہ تھا خاکِ تیرہ میں نور — پرِ کاہ سے یاسمن کا ظہور
ابھی تک ہے اپنی حقیقت سے دور — پریشاں میانِ غیاب و حضور
اِسے بھی تو اب چاہیے اِس کا سوز — کہ آتی نہیں یہ صدا روز روز

"مغنّی دف و چنگ را ساز دہ
بہ آئینِ خوش نغمہ آوازدہ"



ندیم

خوشا یہ وقت کہ پھولوں نے پیرہن بدلا
چمن میں ماہ سے اتری ہے رات کی مہماں
مری نگاہ کتابوں کے ڈھیر سے اٹھی
کہ اِس ہجومِ خموشاں میں کچھ نہیں پنہاں

—

مرے ندیم، کئی بار آخرِ شب میں
مرے چراغ کی لو میں بنی تری تصویر

کنارِ آب چناروں میں ڈوب کر ابھری

خیالِ خواب میں خوابِ خیال کی تعبیر

ندیمِ شوق ، اِدھر نو برس سے شام وسحر

رہِ حیات میں کانٹوں کی جستجو میں ہوں

یہ وہ سفر ہے کہ تو اِس سے بے خبر تو نہیں

ترے سوا میں زمانے میں کس سے عرض کروں

یہ دور اہلِ محبت کو سازگار نہیں

ترا خیال بھی اب تو وفا شعار نہیں



مے خانہ

میں دیکھتا ہوں فضا ہائے احمریں کی نمود

یہ وقتِ شام ہے اِس کو بروضِ گل کہیے

عجب نہیں کہ میسر ہوئی ہے اِس کے طفیل

متاعِ ذوقِ تماشا مرے جنوں کے لیے

بہ پاسِ خاطرِ احباب سوے مے خانہ

نکل پڑا ہوں تو جوشِ قدح ہوا ہے سوا

ہر ایک تارِ ربابِ نظر پکار اٹھا

مرے ورود پہ آئی سبو سبو سے صدا

ترا وجود قیامت ہے بزمِ مے کے لیے

رہی ہے تیرہ شبوں میں تجھے سحر کی تلاش

سنی یہ بات تو ساقی نے مجھ سے فرمایا

ترے لبوں سے نہ آئے لبِ سبو پہ خراش

میں جانتا ہوں کہ رندوں کی آرزو تو ہے

مجھے خبر ہے تمنّائے چار سو تو ہے



ہم سفر

مقامِ شرحِ جنوں پر وہی سرور و حضور
نفس نفس وہی تنہا سرودِ نیم شبی
مری نگاہ سرابوں کی آرزو کا وجود
کہاں سے آئے ندیموں میں ذوقِ تشنہ لبی!

—

اسی خطا پہ گریزاں ہیں ہم سفر میرے
کہ میری طبعِ رواں مصلحت شناس نہیں

وہ ہم سفر کہ زمانے میں جن کی دھوم ہوئی
مثالِ ماہ تھی تیرہ شبوں میں جن کی جبیں

مرے وجود میں پنہاں وجود کا حاصل
زبانِ شعر میں اپنے معلقات کہوں
مری نواؤں سے اب وہ بھی آشنا نہ رہے
مرے ندیم ، میں شہرِ جنوں میں تنہا ہوں

مجھے رفیقِ صبوحی کی جستجو ہی رہی
مرے سبو کی حقیقت تہِ سبو ہی رہی



پتھر

فلک مقام پہاڑوں میں ہر طرف پتھر

سپید و سرخ مثالِ وجود گونا گوں

یہ سب جمود و صلابت میں مثلِ چرخِ بریں

نہ ان میں گرم نگاہی، نہ ان میں سوزِ دروں

—

اسی زمین پہ کھوئے ہوئے زمانوں میں

کیا ہے چشمِ فلک نے عجیب نظارہ

شہیدِ جلوۂ یزداں ہوا کوئی پتھر
کسی کے جسم سے پھوٹا ہوا ہے فوارہ

میں اپنی قوم سے پوچھوں کہ تیرے پہلو میں
یہ ایک دل ہے کہ نرم و گداز مثلِ حریر
میں پوچھتا ہوں کہ میری ہزار سالہ نوا
یہ کیا کہ اس پہ ہمیشہ رہی ہے بے تاثیر

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
عیابِ قدرتِ یزداں کو بے حجاب کرے



رازداں

فضا خموش، سوادِ فلک ہے تیرہ و تار
کہ لٹ گئی ہے کہیں آبروے چرخِ بریں
نگاہِ قلب کے تاروں میں اختلالِ سرود
مرے وجود میں شاید مرا وجود نہیں

شروعِ وادیِ کاغان میں مقامِ جنوں
مقامِ حاصلِ ایماں ، مقامِ الّا ہو

مری حیاتِ پریشاں کی رفعتوں کا مقام
مری قبائے دریدہ کی آرزوے رفو

—

یہی مقام ہے اُس کاروانِ حق کا مقام
گواہ جس کی صداقت پہ عصمتِ جبریل
مری نگاہِ تمنا کی جستجو کا کمال
نواحِ مشہدِ احمد ، مقامِ اسمٰعیل

—

میں اِس مقام کے ذرّوں کو آسماں کہہ دوں
زمیں پہ عرشِ معلّٰی کے رازداں کہہ دوں



لالہ ہائے صحرائی

میں لوحِ ارض پہ اپنے لہو سے لکھتا ہوں
وہ سرگزشت کہ جس میں دل و نظر کا حضور
میں وہ قتیل ہوں، مٹی ہے لم یزل جس کی
جہاں میں دیکھیے، زندہ ہیں شامل و منصور

—

سوادِ قاف، ترے روز و شب میں پیدا ہے
مرے صحیفۂ دل کی روایتوں کا جمال

زہے نصیب کہ دیکھا ہے پھر نگاہوں نے
تری فضاؤں میں دیرینہ عظمتوں کا جلال

نواحِ مرقدِ شامل کے برف زاروں میں
کہاں سے آئے ہیں یہ لالہ ہائے صحرائی؟
یہ شاخ شاخ سے جن کی لہو ٹپکتا ہے
ورق ورق سے نمایاں ہے ذوقِ پیدائی

یہ جن کے داغ سے تابندہ ہے جبیں میری
یہ جن کی آگ سے روشن ہوئی زمیں میری



عشرت دوام

حضورِ قلب کی لذت تلاش کرتا ہوں
بہت گراں ہے طبیعت پہ اب یہ محرومی
یہ جانتا ہوں اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
جنید ہوں میں اگرچہ نہ عارفِ رومی

ہزار غم ہو مگر قبلۂ نگاہِ نیاز
وہی دیارِ محبت ، وہی جلال و جمال

سوادِ ظلمتِ شب کے حجاب میں بھی حضور

یہی ہے دین و شریعت کا منتہاے کمال

—

مری دعا میں وہی گریۂ سحر گاہی!

زہے نصیب کہ پھر اُن کی بارگاہ میں ہوں

وہ ایک سجدہ بظاہر جو روبرو بھی نہیں

مرے وجود کے صحرا میں دجلہ وجیحوں

—

ترے حضور میسر ہو صبح و شام مجھے

یہی سجود رہے عشرتِ دوام مجھے



کونپل

چنار و سرو و صنوبر کھڑے تو ہیں ، لیکن
مری نگاہ میں کونپل کی نازک اندامی
ہوا ، یہ طفل ، یہ بادل ، یہ نخل ، یہ صرصر
نہیں ہے باغ میں کوئی غریب کا حامی

—

میں روز و شب کے تسلسل میں دیکھ سکتا ہوں
مثالِ کاہ تھی کونپل ، شباب پر آئی

فلک مقام درختوں کے درمیاں ابھری
حریفِ صرصر و باراں ، وجودِ رعنائی

—

یہ برگِ نرم سے نخلِ بلند کی صورت
کسی کے حسنِ تخیل کی دیر پیوندی
ذرا نگاہِ تدبر سے دیکھیے اِس کو
کہاں سے پائی ہے ذرے نے شانِ الوندی!

—

ورق ورق سے نمایاں ہیں قدرتیں کس کی؟
نفس نفس میں فروزاں ہیں رحمتیں کس کی؟



دھواں

یہ آبجو کے کناروں پہ یاسمن کا ہجوم

روش روش پہ نخیلِ بلند گوناگوں

یہ شاخ شاخ صبوحی ، یہ باغباں کا لہو

چمن چمن رگِ لالہ میں بند ہے جیحوں

اِدھر ببول کے سایے میں ایک مردِ فقیر

اٹھا رہا ہے نگاہوں کی جستجو کا حجاب

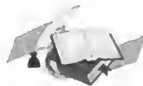
اُدھر چنار کی چھاؤں میں سرخ رو بچے
ورائے چرخ سے بوڑھے کی آرزو کا جواب

—

افق کے پاس فضاؤں میں چمنیوں کا دھواں
ہوا کے دوش پہ مردِ ضعیف نے دیکھا
اٹھا ببول کے سایے سے زرد رو، خاموش
وفورِ یاس میں بچوں کو دیکھ کر بولا

—

یہ چمنیاں کبھی دیکھو تو جا کے سو جاؤ
اسی چنار کی چھاؤں میں دفن ہو جاؤ



مسجد ام القریٰ

وادیوں میں نغمہ زن ، وادیوں کے درمیاں
میرے تخیل کی موج صورتِ دریا رواں

اپنے زمانوں سے دور، اپنے جہاں سے الگ
دیکھ رہا ہوں کوئی اجنبیوں کا جہاں

دستِ قضا میں ہے پھر خامۂ معجز رقم
چرخِ بریں پر ہوئی لوحِ ازل بے نقاب

عرصۂ افلاک میں روحِ جہاں کا نزول
میری نگاہوں میں ہے صفحۂ ام الکتاب

ساری زمیں آسماں ، سارا افق کہکشاں

جلوہ گہِ ماہتاب صبحِ درخشاں کا نور

مطلعِ خورشید ہے وادیِ ایمن تمام

حلقۂ انجم میں ایک مردِ خدا کا ظہور

بندۂ خاکی مگر ساری خدائی میں فرد

اپنے خدا کے حضور ناصیہ سائی میں فرد

ساری خدائی میں وہ ایک خدا کا خلیل

جادۂ حق پر رواں، جادۂ حق کی دلیل

عہدِ کہن ہو کہ نو، تیرگیوں کے لیے

جلوۂ برقِ فنا اس کا پیامِ رحیل

علم کی برہان وہ ، قاطعِ برہان بھی

عقل ہے اس کی عفیف، دین ہے اس کا حنیف

ڈوبنے والوں پہ ہے اس کی صدا 'لا الہٰ'

دیکھیے پہنچی کہاں ، اس کی نگاہِ لطیف

اس کی تگ و دو میں تھی گرمیِ یوم النشور

صدق و صفا کا سفر، صدق و صفا راحلہ

فرطِ انابت میں ہے آپ ہی اپنی نظیر

لوط کے آزار پر اُس کا خدا سے گلہ

اپنے خدا کے حضور اُس کی ادائیں عجیب

اُس کی صدائیں عجیب، اُس کی دعائیں عجیب

واقفِ اسرارِ حق ، صاحبِ قلبِ سلیم

اُس کی وفا کا صلہ آیۂ 'ذبحِ عظیم'

سیدِ عالم ہے وہ ، دین کا محور ہے وہ

شرعِ محمد وہی ، اُس کے مسیح و کلیم

اپنے زمانے میں وہ روحِ امم کا بروز

وسعتِ افلاک ہے ذرۂ ہستی میں بند

اُس کی جبیں سے عیاں نیمۂ شب کا سجود

اُس کی زباں پر صدا ، اُس کا دلِ دردمند

اُس کے شب و روز میں صبحِ ازل کی نمود

اُس کی حیات و ممات معنیِ عہدِ الست

ولولۂ شوق میں لختِ جگر کے لیے

مرضیِ مولا پہ وہ ، دیکھیے شفرہ بدست

اُس کی نگاہوں کا نور 'اشہدان لاالٰہ'

اُس کا سرور و حضور 'اشہدان لاالٰہ'

مسجدِ ام القریٰ ، معجزہ اُس کا ہے تو

تیری فضاؤں میں ہے ،اُس کی نوا چارسو

اُس کی اذانوں سے تو قبلۂ دینِ متیں

شرق ہو یا غرب ہو ، تو ہی مرے روبرو

تیرے درو بام پر برقِ تجلی تری

ظلمتِ افکار سے آج بھی گرمِ ستیز

سینۂ آدم میں دل ، خوابِ گراں سے خجل

تیری اذانِ سحر ، غلغلۂ رستخیز

آج بھی دنیا میں تو مرجعِ خیر الامم
اہلِ جہاں کے لیے حجتِ پروردگار
اول و آخر ترا ، رفتہ و حاضر ترا
صبحِ نخستیں سے ہے تیری بنا استوار
پیکرِ گِل میں نہاں روحِ براہیم تو
پیکرِ گِل سے عیاں آیۂ تسلیم تو
سامنے پہلو میں وہ لولوے اسود ترا
پتھروں میں آج بھی پتھروں سے ماورا
اہلِ نظر کے لیے ربِ محمد کا ہاتھ
باندھتے ہیں جس سے وہ چوم کے عہدِ وفا
سالکِ رہ کے لیے قلب و نظر کی حیات
سایۂ مہتاب میں ساتھ ہی مروہ کے پاس
دیکھ رہا ہوں ترے قدسیوں کی رہ گزر
نور کی ہو جس طرح دجلہ و نیل و بیاس

سجدہ گہِ مصطفیٰ تجھ کو زمیں پر سدا

دیکھتا ہے رشک سے گنبدِ نیلوفری

عرشِ معلیٰ پہ ہے اور نہیں ہے کہیں

تیرے مناروں پہ یہ نور کی جلوہ گری

نور ترا اندروں ، نور ہی پیکر ترا

نور کی صہبا ہے تو ، نور ہے ساغر ترا

تجھ سے زمانے پہ فاش وحدتِ انساں کا راز

تیری نمازوں میں ایک بندہ و بندہ نواز

ایک ہی سب کا خدا، آدم و حوا بھی ایک

اور یہ مٹی کے رنگ ، ان میں رتوں کا گداز

مسجدِ ام القری ، میری نگاہوں میں تو

اپنی حقیقت میں ایک چشمۂ آبِ حیات

تجھ سے میسر ہوا عشق کا سوز و سرور

مرجعِ صدق و یقیں ، تجھ سے دلوں میں ثبات

دھوپ کے صحرا میں تو اگلے زمانوں کا پیڑ
آگ کے دریا میں ایک لکۂ ابرِ کرم
دیکھ رہا ہوں کہ یہ مردِ مسلماں ترا
جس کی دعاؤں سے تھا مزرعِ ہستی میں نم

اس کا افق چار سو رنگِ سحر کے بغیر
شعر و سخن ، ہائے وہ خونِ جگر کے بغیر

بزمِ جہاں میں ہوا اس کا فسانہ تمام
آہ کہ ہونے کو ہے عالمِ ہستی کی شام

مشرق و مغرب میں ہے فتنۂ یافت کا دور
عقل بھی اُس کی غلام، عشق بھی اُس کا غلام
مے کدوں میں ہر طرف منبعِ علم و حضور
اُس کی ادا، اُس کا ذوق، اُس کا خمِ واژگوں
علمِ خدا آشنا ، دانشِ عقبیٰ شناس
یہ بھی طلسم و جنوں، وہ بھی طلسم و جنوں

اس سے ہوئے آشکار پہلے صحیفوں کے راز

مہر و مہ و آسماں ، اِس کی مشینوں پہ دنگ

آپ ہی اپنا خدا ، آپ ہی اپنا رسول

فلسفہ و فکر و فن ، ایک لہو کی ترنگ

ڈھونڈتا ہے روز و شب اپنے جہاں کا دوام

اپنے جہاں کے لیے رشتۂ جاں کا دوام

اس پہ قیامت ہے اب اس کے بدن کی کشود

جس میں لہو کی طرح دوڑتا پھرتا ہے سود

اس کے جواں، اس کے پیر مرگِ امومت سے زار

اس کے تمدن میں عار شرم و حیا کا وجود

شعلۂ بے سوز ہے دختر یافت کا گیت

پردۂ افکار میں غلغلۂ حرف و صوت

اس کے در و بام پر ڈھونڈ رہی ہے اسے

حسنِ مروت کی موت، جذبۂ غیرت کی موت

روح و رواں سے تہی، زندہ و بیدار بھی

سارے زمانوں سے ہے، اس کا زمانہ عجیب!

عارف و عامی تمام اس کی سیاست سے خوار

اور وہ دنیا میں ہے عالم نو کا نقیب!

اس کی خبر الاماں، اس کی نظر الاماں!

خار و خس دہر میں اس کا شرر الاماں!

مسجدِ ام القریٰ ، اس کی شبوں کا فراغ

ڈھونڈ رہا ہے کوئی ظلمت شب میں چراغ

اس کو عطا ہو وہی وادیِ فاراں کا نور

میری نواؤں میں ہے آج بھی جس کا سراغ

خالقِ ارض و سما ، قلبِ مسلماں کو دے

دعوتِ حق کا جنوں ، اپنی عبادت کا شوق

مجھ کو عطا کر کہ ہے میری نوا کا صلہ

اشکِ سحر کے لیے اپنی محبت کا ذوق

اپنے مسلماں کو دے آتشِ رفتہ وہی
جس سے ملا تھا کبھی علم کو سوزِ یقیں

آں سوے افلاک سے پھر وہ نگاہِ کرم
جس نے کیا تھا اسے ظلمتوں میں راہ بیں

خاک کا پیکر ہوں میں ، روحِ براہیم دے
میرے صحیفوں کو پھر آیۂ تسلیم دے



وادی کشمیر

اب یہاں رنگِ بہاراں ہے جوانوں کا لہو
سرخ رو ہیں وادیِ کشمیر میں کوہ و دمن
سر برہنہ بیٹیوں کے پیرہن بکھرے ہوئے
مرثیہ خواں ہر در و دیوار پر مرغِ چمن

—

موسمِ گل زرد پتوں کی ردا پہنے ہوئے
ڈھونڈتا ہے دخترِ گل مرگ کا عہدِ شباب

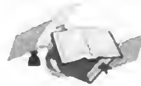
آب جوؤں کا ترنم نوحۂ غم کی صدا
سرفگندہ وادیوں میں آبشاروں کے رباب

—

چھوڑ جاتی ہے اِدھر بھی وادیِ نیلم کی رات
ہر طرف بارود گولوں کی تباہی کے نشاں
ہند کے اربابِ دانش اب بھی سنتے ہوں اگر
آگ میں جھلسے ہوئے معصوم بچوں کی فغاں

—

پوچھیے ان سے کہ جمہوری سیاست ہے یہی!
عہدِ حاضر میں بھی آزادی کی قیمت ہے یہی!



جرمِ ضعیفی

[المیہ کوسووا پر لکھی گئی]

اِس شاخ پہ کژدم ہیں تو اُس شاخ پہ اژدر
بیٹھے ہیں کہ محرومِ نشیمن ہوں پرندے
باقی ہے کوئی داد نہ فریاد کی صورت
بستی میں نکل آئے ہیں جنگل سے درندے

—

اترے ہیں جہنم سے کہ ماؤں نے جنے ہیں
یہ سرب ہیں یا روم کے جلاد سپاہی

انساں ہیں کہ صحرا میں شبِ تار کی وحشت
آدم ہیں کہ ابلیس کے چہرے کی سیاہی

—

غرناطہ و بغداد میں پہلے بھی ، مسلماں
دیکھی ہے یہی جرمِ ضعیفی کی مکافات
افلاک بھی سنتے نہیں بے ہمتِ مرداں
ہو ضربِ کلیمی تو اتر سکتی ہیں آیات

—

اس دور میں ہمت کی بنا علم و ہنر ہے
یہ ورنہ تری خاک میں پوشیدہ شرر ہے



ماں

اُس کی ہستی وجود کا محور
اُس کی آغوش وسعتِ افلاک
اس کی صحبت تھی درد کا درماں
تلخیِ غم میں زہر کا تریاک

—

ظلمتوں کے ہجوم میں تاباں
اِک جبیں جس کی روشنی مہ تاب

ہر بیاباں میں ڈھانپ لیتی تھی

اِک ردا جس میں رحمتوں کے سحاب

دشت و صحرا میں ، لالہ و گل میں

صبر و ایثار کا وجود تمام

اُس نے کلکِ وفا سے لکھا ہے

میری ہر رہ گزر پہ اپنا نام

اب اُسی مہرباں کو روتا ہوں

خاک پر آسماں کو روتا ہوں



لالہ

نوحۂ غم کا زیر و بم موجۂ آتشِ سراب
تارِ نفس میں دم بدم ٹوٹ رہے ہیں آفتاب
تہ میں سلگ رہی ہے پھر آتشِ قلبِ سوختہ
دیکھ رہا ہوں لالہ رنگ بحرِ وجود میں حباب
فاش مری نواؤں میں میرے دل و جگر کا سوز
صاحبِ ساز کے لیے پردۂ ساز بے حجاب

میری زباں پہ حرف وصوت، شورشِ ہاے و ہو تمام
میری نوا میں نقش بند آج مرا لہو تمام

میرے افق پہ صبح و شام جلوۂ دخترِ فرنگ
اس کی اداے دل فریب تیرہ شبوں میں لائی رنگ

میرے جہاں میں روز و شب تیز صداے بولہب
میرے وجود کی فضا آہ، مری اذاں پہ تنگ

اپنے مقام پر سروش، نے کی حکایتیں خموش
معجزۂ ہنر ہے اب ایک یہی لہو ترنگ

روح و بدن، دل و جگر، زخم کہاں کہاں نہیں!
کس سے کہوں یہ ماجرا، حوصلۂ بیاں نہیں!

میرے لیے مرا وجود ایک شکستہ آرزو
اپنے ہدف سے بے نصیب میری تمام جستجو

دیکھ خداے لم یزل، ڈوب رہی ہے دم بدم
اہلِ حرم کے روبرو، اہلِ حرم کی آبرو

مے کدۂ وجود میں بکھری ہوئی ہیں کرچیاں

چاٹ رہا ہوں شام سے بادۂ پارۂ سبو

میرے حواس بے ثبات، میری رگوں میں زہر ہے!

موت ہوئی مری برات، میری رگوں میں زہر ہے!

آہ، مرا بدن تمام پارۂ برف سے بھی سرد

کھوئے ہووں کے شہر میں پرتوِ شام سے بھی زرد

شمعیں جلاؤ خون سے، تیرہ و تار ہے فضا

سارے افق پہ چھا گئی ڈوبتے قافلوں کی گرد

اپنی خودی سے بے خبر، ایک فغانِ بے شرر

تارِ نفس، نہ زخمہ ور، دیکھ چکا میں فرد فرد

کس سے کہوں جہاں میں اب خیرِ امم ہے کیا یہی!

اِس کا عرب ہے کیا یہی! اِس کا عجم ہے کیا یہی!

میرے تمام روز و شب، قافلہ ہائے بے دلیل

ان میں نفس نفس بپا غلغلۂ دمِ رحیل

راکھ ہوئی ، بکھر گئی وادیِ دجلہ و فرات

دور کھڑے ہیں سر بہ جیب، ارضِ حجاز میں نخیل

شمعِ نفس خموش ہے ، اب کوئی روشنی نہیں

صحنِ حرم میں بجھ گئی آتشِ نغمۂ خلیل

شیخِ حرم بھی کھو گیا اپنے توہمات میں

آئے گا اب کہاں کوئی معرکۂ حیات میں!

آہ کہ ہے لہو تمام تارِ نفس پہ موج زن

پاؤں تلے نشیب میں جوے رواں شکن شکن

ذروں نے پی لیا ہے سب میرے دل و جگر کا خوں

شاخ پہ ریگ زار میں لالۂ سرخ پیرہن

میری نواؤں کا وجود، میری صداؤں کا شہود

پیکرِ شورشِ سخن، سیلِ سرشک کا بدن

میں نے قبا میں رکھ لیا شاخ سے توڑ کر اسے

دیکھیں گے چوم چوم کر اہلِ دل و نظر اسے

میں کہ مری نوائے شوق آئنۂ مشاہدات

مجھ کو حضورِ عشق میں لائے ہیں میرے واردات

ہاتھ میں اک شکستہ نے، اُس میں وہی غزل کی لے

دیکھ رہا ہوں پے بہ پے، قلب و نظر کے معجزات

روحِ حرم ہے سامنے، میرا حرم ہے سامنے

جس کے پیامِ شوق سے میری نواؤں میں ثبات

بت کدۂ صفات میں، میری زباں پہ لا الہٰ

اس کی تجلیات میں، میری زباں پہ لا الہٰ

اے کہ ترے وجود سے راہِ حیات کا سراغ

اِس شب تار میں نہیں تیرے سوا کوئی چراغ

عقل تھی تشنہ لب مگر، مے کدۂ حیات میں

بادۂ ذوق و شوق کے تو نے لنڈھا دیے ایاغ

تیری تلاش میں رہی صدیوں سے میری آرزو

غم زدۂ فراق ہوں، سینہ مرا ہے داغ داغ

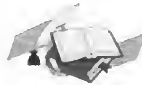
عرشِ بریں کی راہ داں تیری جبیں مرے لیے
راہ نما ترے سوا کوئی نہیں مرے لیے

قافلہ ہائے شوق میں تو ہے امیرِ کارواں
میں کہ غریبِ شہر ہوں، ہم سفروں کے درمیاں

میری رگوں سے بہ گئی میرے لہو کی بوند بوند
اپنے جنوں کی داستاں، کیسے کہے مری زباں

خون کے لالہ زار سے لایا ہوں نذر کے لیے
لالہ کہ جس کے داغ میں میرا وجود ہے نہاں

'اے کہ زمن فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را'



شہر آشوب

اٹھتا ہے یہ ہر لفظ سے جو دل کا دھواں ہے

پھر اس میں عجب کیا کہ غزل مرثیہ خواں ہے

سینے میں کوئی درد ہے، پنہاں کبھی پیدا

پہلو میں دھڑکتا تھا جو آنکھوں سے رواں ہے

وہ دن ہے کہ ویرانیِ دل کھانے کو آئے

وہ شب ہے کہ ہر سانس پہ اک بارِ گراں ہے

تہذیب نے کچھ اور بھی سفاک بنا کر

آدم کو بتایا ہے کہ یہ تیرا جہاں ہے

دنیا کی سیاست میں کوئی حق ہے نہ باطل

ہر چیز یہاں معرکۂ سود و زیاں ہے

اٹھتی ہے صدا کوئی تو اربابِ سیاست

اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ غوغاے سگاں ہے

افسوس کہ پژمردہ ہے انصاف کا چہرہ

اور ظلم کو دیکھیں تو وہ پہلے سے جواں ہے

بغداد میں یہ آہن و آتش کا تماشا

روتی ہے زمیں اور فلک اشک فشاں ہے

خورشیدِ جہاں تاب تو ہے اب بھی افق پر

اس شہر میں لیکن شبِ تیرہ کا سماں ہے

واللہ کہ تم درپۓ بربادیِ جاں ہو

یہ شہر مری عظمتِ رفتہ کا نشاں ہے

اڑتا ہوا خاشاک ، یہ بکھری ہوئی لاشیں

انساں ہیں، مگر اُن پہ بھی سایوں کا گماں ہے

بارود کی بارش ہے شب و روز یہاں اب

بچوں کو اماں ہے، نہ بزرگوں کو اماں ہے

یہ ماؤں کی آغوش میں آزردہ نگاہیں

سنتا ہو اگر کوئی تو ان کی بھی زباں ہے

میں عاجز و درماندہ اسے دیکھ رہا ہوں

دینے کو اگر ہے تو یہی سوزِ نہاں ہے

ابلیس کے ہاتھوں میں ہے دنیا کی حکومت

یہ تیرا جہاں ہے تو خدایا، تو کہاں ہے



دعا

لب پہ آتی ہے آرزو میری

اب اُنھیں بھی ہو جستجو میری

پابہ گِل ہوں اگرچہ دنیا میں

سوے افلاک ہے نمو میری

لے کے نکلا ہوں پھر چراغ اپنا

ہاتھ میں اُن کے آبرو میری

علم و دانش کی بارگاہوں میں

شبنم آسا ہو گفتگو میری

حرف میرے ہیں بات اُن کی ہے

بات پہنچے یہ چار سو میری

جرعہ جرعہ عطا ہو رندوں کو

ساقیا ، آتشِ سبو میری

بحرِ ہستی میں گم نہ ہو جائے

اک ذرا سی ہے آبجو میری

رحمتِ حق سے ہو بھی سکتی ہے

پھر قبائے ہنر رفو میری

روزِ محشر نہ آشکارا ہوں

لغزشیں سب کے روبرو میری



دریا بہ حباب اندر



اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام وسحر تازہ کریں

عالمِ نو ہے، ترے قلب ونظر تازہ کریں

اِس زمانے کو بھی دیں اور زمانہ کوئی

پھر اٹھیں ولولۂ علم وہنر تازہ کریں

تیری تدبیر سے نومید ہوئی ہے فطرت

راستے اور بھی ہیں، رختِ سفر تازہ کریں

شعلۂ طور اٹھے آتشِ فاراں ہو کر

پھر تری خاک میں پوشیدہ شرر تازہ کریں

حرف وآہنگ نہ ہوں سوزِ دروں سے خالی

ہر رگِ ساز میں اب خونِ جگر تازہ کریں



ہم نے مانا کہ یہاں اب کوئی بیداد نہیں
دیکھتے ہو کہ کسی لب پہ بھی فریاد نہیں

زخمہ ور ، شوکتِ پرویز کا نغمہ ہر سو
ہر طرف جشن کہ اب شہر میں فرہاد نہیں

سگِ آوارہ تو بستی میں کھلے ہیں ، لیکن
حادثہ یہ ہے کہ پتھر کوئی آزاد نہیں

اب تو فردوسِ تخیل میں بھی مشکل ہے کہ ہو
وہ نشیمن کہ جہاں گھات میں صیّاد نہیں

راہِ تقلید نہیں ، دونیِ ہمت ہے فقط
وہ سفر کیا ہے جسے خطرۂ افتاد نہیں

ہر نفس زندہ و بیدار عنایت اس کی
تم اسے یاد ہو ، پر تم کو خدا یاد نہیں

دشت و صحرا ہی سے نسبت ہے تجلّی کو اگر
دل کا ویرانہ بھی غرناطہ و بغداد نہیں



رہتی ہے اگر گردشِ دوراں کوئی دن اور
دیکھیں گے یہی آدم و یزداں کوئی دن اور

شاید اِسی فرمان پہ قائم ہے جہاں اب
رہنے دو اِسے دست و گریباں کوئی دن اور

تہذیب کی یلغار میں ہے یہ بھی غنیمت
ناچار ہی رہ جائیں مسلماں کوئی دن اور

تیرہ ہیں مہ و مہر تو ہم اپنے لہو سے
کر دیتے ہیں یہ بزم چراغاں کوئی دن اور

بڑھتا ہی رہا دردِ ستم گر کی دوا سے
کیا خوب تقاضا ہے کہ درماں کوئی دن اور

ہوتی ہے اگر گرمیِ محفل کی تمنا
کر لیتے ہیں تنہائی کو مہماں کوئی دن اور

اس دور میں سرمایۂ اربابِ نظر بھی
اب ہو گا فراہی کا دبستاں ، کوئی دن اور



ترا وجود نظر کی تلاش میں ہے ابھی

یہ خاک اپنے شرر کی تلاش میں ہے ابھی

پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کارواں اپنا

اگرچہ رختِ سفر کی تلاش میں ہے ابھی

افق سے ڈھونڈ کے لائی تھی آرزو جس کو

وہ آفتاب سحر کی تلاش میں ہے ابھی

تری نوا میں کمالِ ہنر تو ہے، پھر بھی

ذرا سے خونِ جگر کی تلاش میں ہے ابھی

سمجھ ہی لے گا حقیقت سے آشنا ہو کر

زمانہ فوقِ بشر کی تلاش میں ہے ابھی

حضورِ عشق میں آئی تو ہے خرد، لیکن

وہاں بھی نفع وضرر کی تلاش میں ہے ابھی

مرا غزال سوادِ ختن میں آ پہنچا

سنا ہے اپنے ہی گھر کی تلاش میں ہے ابھی



وہی ہے دہر میں اپنے مقام سے آگاہ
ہوا جو لذتِ ذکرِ دوام سے آگاہ

یہ تیرا علم و محبت ، یہ معرفت ، یہ خیال
ہوئے نہ آہ ،خدا کے کلام سے آگاہ

سمجھ ہی لے گی شریعت کا مدعا بھی خرد
اگر ہے اپنے حلال و حرام سے آگاہ

ترے جہاں میں غریبوں کی زندگی کیا ہے!
نہ اپنی صبح سے واقف ، نہ شام سے آگاہ

وفورِ شوق میں کہہ دی ہے سرگزشت اپنی
وگرنہ آپ ہیں اپنے غلام سے آگاہ



علم آشفتہ ، عقل بے انداز　　آ رہی ہے مگر صدائے حجاز

زندگی کیا ہے؟ حسرتوں کا مزار　　یا پھر اندیشہ ہائے دور دراز

بزمِ ہستی سے بے صدا آتے　　اٹھ گیا بے خودی میں پردۂ ساز

ڈھونڈ لیتی ہے آرزو کی کرن　　وسعتِ آسماں ، پرِ پرواز

پھر وہی جسم و جاں میں ہجر و وصال　　پھر وہی انتہا، وہی آغاز

ہر سو آوارگیِ فکر و نظر　　اب کہاں دردِ آگہی کا گداز

فصلِ گل چھیڑتی ہے تارِ رباب　　شوق ہوتا ہے زمزمہ پرداز

وقت خاموش بھی ہے گویا بھی　　کھول دیتا ہے آپ اپنا راز

جلوۂ ناز میں ہے حسنِ ازل

یہ مرا سجدۂ جبینِ نیاز



اے کاش ، کبھی سنتے معنی کی خبر لائی
الفاظ کے پیچوں سے انساں کی شناسائی
کیا رنگ دکھائے گی خرمن میں یہ چنگاری
ہر شخص ہے بستی میں خاموش تماشائی
اجڑے ہوئے خیموں کے خونابۂ مژگاں سے
آتی ہے تمدن کی تعمیر میں رعنائی
پھر شہرِ ملامت کے ہر کوچہ و منزل میں
مجروحِ تماشا ہے آشفتۂ تنہائی
میرے لیے کافی ہے ویرانۂ دل میرا
افلاک سے بڑھ کر ہے اس دشت کی پہنائی

﴿۸﴾

دل ہے، مگر کسی سے عداوت نہیں رہی
دنیا وہی ہے ، ہم کو شکایت نہیں رہی

میں جانتا ہوں دہر میں اس قوم کا مآل
علم و ہنر سے جس کو محبت نہیں رہی

خوفِ خدا کے بعد پھر اک چیز تھی حیا
وہ بھی دل و نگاہ کی زینت نہیں رہی

دنیا ترا نصیب ، نہ عقبیٰ ترا نصیب
اب زندگی میں موت کی زحمت نہیں رہی

وہ دن قریب آ لگا ، آئے گی جب صدا
'بابر بہ عیش کوش' کی مہلت نہیں رہی

درماندۂ حیات ہوں ، دل تو نہیں لگا
اتنا ضرور ہے کبھی وحشت نہیں رہی

سرما کی شام ہے کوئی اجڑے دیار میں
جس زندگی میں شوق کی حدت نہیں رہی

اس رہ روی میں جادہ و منزل بھی دیکھ لیں
یارانِ تیز گام کو فرصت نہیں رہی

شعر و سخن کی ، بادہ و ساغر کی گفتگو
جی چاہتا ہے ، پر وہ طبیعت نہیں رہی

پیدا کہاں یہ علم و محبت کا رازداں
تم کو فقیر سے کبھی صحبت نہیں رہی



یہ دورِ جہاں کیا ہے؟ دریا بہ حباب اندر

پنہاں بہ حباب اندر، پیدا بہ حباب اندر

خاکی ہو کہ افلاکی، یہ سیر و سفر تیرا

ناقہ بہ حباب اندر، صحرا بہ حباب اندر

صوفی کی شریعت میں دو حرف یہی پائے

دنیا بہ حباب اندر، عقبیٰ بہ حباب اندر

مے خانۂ ہستی کا یہ رنگ بھی دیکھا ہے

مستی بہ حباب اندر، صہبا بہ حباب اندر

اک طرفہ تماشا ہے افرنگ کا طوفاں بھی

آدم بہ حباب اندر، حوا بہ حباب اندر



امن کا نام لبوں پر ہے ، سناں پہلو میں
اک زباں منہ میں ہے اور ایک زباں پہلو میں

اب تو لگتا ہے کہ تہذیب کا حاصل ہے یہی
ہاتھ میں جام ، کوئی حورِ جناں پہلو میں

قافلہ ہے نہ جرس ، گرمِ سفر ہوں پھر بھی
ساتھ چلتی ہے تو اک ریگِ رواں پہلو میں

سیر دیکھیں گے ، ذرا دیر کو آئے تھے مگر
دل نہیں ، یہ تو نکل آیا جہاں پہلو میں

یوں تو قرآن بھی ہے خانقہوں کی زینت
ساتھ رہتا ہے مگر سرِّ نہاں پہلو میں

اسی امید پہ کھویا تھا کہ پالیں گے اِسے
دل نے چھوڑا نہ کوئی اپنا نشاں پہلو میں

لوٹ آتی ہے نوا ہو کہ فغاں ہو میری
یہ ترا دل ہے کہ اک سنگِ گراں پہلو میں



اس پر ہوا ہے دہر میں اپنا سفر تمام
آشفتۂ فرنگ ہیں علم و ہنر تمام

عالم بھی تھا نگاہ میں ، لیکن زہے نصیب
اب اُن کی نذر کردیا ذوقِ نظر تمام

دیکھا ہے جب بھی حسن کو فطرت میں بے نقاب
زنداں لگے ہیں شہر کے دیوار و در تمام

اُس دن کی خیر جس میں بہ صد شوقِ آگہی
برپا ہوا یہ معرکۂ خیر و شر تمام

سنتے کہیں تو حسن و محبت کی داستاں
اِس شہر کے خطیب ہوئے نوحہ گر تمام

اپنے ہی سنگ وخشت سے ہرسُو اٹی ہوئی
صدیوں سے دیکھتا ہوں تری رہ گزر تمام

بزمِ سخن میں تیرگیِ شب تھی روبرو
لایا ہوں اپنی خاک میں پنہاں شرر تمام

اٹھتی ہے موج یورشِ غم کا خروش ہے
اس پر بھی دیکھتا ہوں کہ دریا خموش ہے
ہاتھوں میں کیا ہے لمحۂ موجود کے سوا
عالم یہ وہ ہے جس میں نہ فردا نہ دوش ہے
علم وادب، نہ حسنِ طبیعت، نہ ذوق وشوق
تہذیب کا کمال یہی نائے ونوش ہے؟
یہ سرزمین وہ ہے کہ دھونی رمایئے
پھر جس کو دیکھیے وہی حلقہ بگوش ہے
آتی تو آسماں سے ہے، کیا جانیے مگر
ابلیس کی صدا کہ نوائے سروش ہے
کھلتے ہیں پھول پھر بھی برہنہ ہے شاخ شاخ
سونپا تھا جس کو باغ وہی گل فروش ہے
جاؔوید اس فضا میں کہاں احتسابِ خویش
جس شخص کو بھی دیکھیے آئینہ پوش ہے



دنیا کی دولت مردِ زمینی　　رومی نہ شامی ، ہندی نہ چینی

سوتوں کو بیدار کرنا ہے آساں　　مشکل ہے لیکن باز آفرینی

ہوتے ہیں باہم دین و سیاست　　پہلے اگر ہو تہذیب دینی

کرتی ہے اب بھی مٹی کو سونا　　علم و نظر کی خلوت گزینی

آئی کہاں سے حرف و سخن میں

یہ دل نوازی ، یہ دل نشینی

﴿۱۴﴾

پھر ہوئے زینتِ دیوارِ حرم اے ساقی
توڑ ڈالے تھے جو پتھر کے صنم اے ساقی

راہ رو گرمِ سفر پشت بہ منزل ہو کر
ہے یہی آج بھی تقدیرِ امم اے ساقی

مے کدہ چھوڑ تو دیں تیری جفا پر، لیکن
یاد آجاتا ہے پھر تیرا کرم اے ساقی

تیری صحبت ہی وہ فردوس ہے دنیا میں جہاں
کوئی اندیشۂ فردا ہے نہ غم اے ساقی

روئے زیبا نہ سہی، گردشِ مینا ہی سہی
کچھ تو رہ جائے فقیروں کا بھرم اے ساقی

روح خاموش ہے صدیوں سے، بدن گرمِ سرود
اب کہاں سوزِ عرب، سازِ عجم اے ساقی!

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

دین تو تھا ہی سیاست بھی ہے ملا کے سپرد
اور باقی ہے کوئی ہم پہ ستم اے ساقی؟

عقل ہو جاتی ہے منزل سے گریزاں جب بھی
دیکھ لیتے ہیں ترا نقشِ قدم اے ساقی

﴿۱۵﴾

علم آزردہ ہے اپنی حسرتِ تعمیر میں
شام آ پہنچی افق پر اِس جہانِ پیر میں
میں نے چاہا تھا کہ دیکھوں خواب کچھ تیرے لیے
اور تو ظالم ، الجھ کر رہ گیا تعبیر میں
جانتے ہو کس لیے ہے شعلہ افشانی مری ؟
ہے ابھی شاید کوئی حلقہ تری زنجیر میں
کھینچ کر اُس کو نہ رسوا ہوں کبھی مردانِ حق
دم اگر باقی نہ ہو کچھ سینۂ شمشیر میں
یہ جہاں وہ ہے کہ اِس میں اُن کو دیکھا چاہیے
صفحۂ عالم پہ اُن کی شوخیِ تحریر میں



اب نئی منزلوں کے خواب کہاں ہر قدم پر نیا سراب کہاں
لذتِ غم کی بے خودی ہے فقط ساقی و مطرب و شراب کہاں
ایک غوغا ہے آں سوے افلاک پوچھتے ہیں، مگر جواب کہاں
اب کوئی شمعِ آرزو ہی سہی ظلمتِ شب میں آفتاب کہاں
قعرِ دریا کو کھینچ لایا ہے موجۂ عشق میں حباب کہاں
ایک عالم کتاب خواں ہے مگر ایک بھی صاحبِ کتاب کہاں
آبلوں کا لہو ہے کانٹوں پر اس چمن میں کوئی گلاب کہاں
اس تمدن میں اب حیا کیسی؟ رہ گیا ہے کوئی حجاب کہاں
علم آلودۂ سیاست ہے
دعوتِ حق کا اضطراب کہاں



علم و نظر سے ماورا اپنے حریمِ ذات میں
علم و نظر کے روبرو آئنۂ صفات میں

جلوہ نما ہے روز و شب ، ایک نئی ادا کے ساتھ
تجھ کو جہاں بھی دیکھیے عالمِ شش جہات میں

تیری کتاب کے سوا ، دیکھ چکا میں شرق و غرب
کچھ بھی ٹھہر نہیں سکا سیلِ تغیرات میں

عقل ہے آج بھی اگر اپنے جنوں کی نقش بند
عشق بھی تو اسیر ہے اپنے ہی واردات میں

تیرے کلام میں کوئی حرف کہاں تھا پیچ کا
میں ہی الجھ کے رہ گیا اپنے توہمات میں

دستِ فرنگ میں ترے مینا و جام واژگوں
کیا نہیں اور مے کہیں مے کدۂ حیات میں

تیرے کرم سے پے بہ پے اترے ہیں آسماں سے آج
قافلہ ہاے رنگ و بو میرے تخیلات میں



یہی زہراب ہے ، یہی تریاق　　آرزو ، جستجو ، وصال و فراق

پڑھ رہے تھے فسانہ ہائے وجود　　پھر کسی نے الٹ دیے اوراق

دل اگر ہو خدا سے بے گانہ　　صبر ہوتا ہے آدمی پر شاق

درسِ حکمت ہے زندگی کے لیے　　اے مہِ نو ، ترا عروج و محاق

غم سے ایوان کلبۂ احزاں　　سر خوشی ہو تو جھونپڑے بھی رواق

برق آسا تھی ہر نوا ، لیکن　　تیرا جوہر نہ کر سکی براق

سوے بطحا یہ رہرووں کا ہجوم
دل اسی رہ گزر کا تھا مشتاق

بہارِ نغمہ خزاں رسیدہ ، قبائے سرو وسمن دریدہ
افق پہ یہ لالہ زار تیرے ، اِدھر بھی کوئی گلِ دمیدہ
نئے زمانوں میں کھو گیا تھا ، اسے کوئی راستہ بتا دے
ترے بیاباں کو ڈھونڈتا ہے وہی ترا آہوِ رمیدہ
یہی ہے مشرق، یہی ہے مغرب، یہاں بھی دیکھا، وہاں بھی دیکھا
خرد پہ ذوقِ جنوں گراں ہے ، جنوں سے ذوقِ خرد کبیدہ
نئی خلافت کا غلغلہ ہے ، کہاں وہ فردوس کی منادی
زمیں پہ جنت بنے گی آخر یہی ہے اس دور کا عقیدہ
نہ وہ زماں ہے، نہ وہ مکاں ہے ، عجیب منظر بدل رہا ہے
ہوا ہے خواب و خیال وہ بھی جو تھا کبھی دیدہ و شنیدہ
اسی جہاں میں نیا جہاں اب یہ تو نے آدم کو دے دیا ہے
وہ چشمِ تر بھی عطا ہو اِس کو رہے جو خلوت میں آب دیدہ

﴿۲۰﴾

ظلمتِ شب سے گریزاں آفتاب
تیرگی عریاں ، افق غرقِ سحاب
رات کا صحرا ، حجازی قافلے
ٹوٹ کر بکھرے ہوئے صدیوں کے خواب
دیکھیے ہر سو بدن گرمِ سرود
روح باقی ہے ، نہ اُس کا اضطراب
حادثہ یہ ہے کہ دنیا میں کبھی
لوٹ کر آتا نہیں عہدِ شباب
دختِ افرنگی ، یہ غمزہ ، یہ ادا
کون لائے گا ترے جلووں کی تاب
دیکھتا کوئی یہ کابل کے اسیر
بے صدا چہرے ، نگاہوں میں سراب
بات کچھ یہ بھی سمجھ لینے کی تھی
دعوتِ حق کی صدا یا انقلاب؟
یہ خطا کم ہے کہ اُن کے شہر میں
دیکھ سکتا ہوں صواب و ناصواب!
وادیِ فاراں ، وہ دن بھی یاد ہیں؟
تیرے پتھر جب ہوئے تھے لعلِ ناب

﴿۲۱﴾

حضورِ عشق بھی روشن ہے علم کی قندیل
اٹھا سکا نہ جہاں میں کوئی حجابِ دلیل

مرے وجود کی آتش میں رحمتِ باراں
وہی کلام کہ ہے نغمۂ دمِ جبریل

تری نگاہ حقیقت شناس ہو تو کہوں
کہ مال و دولتِ دنیا ہے اک متاعِ قلیل

خطا کہیں تو ہوئی ہے، اسے بھی دیکھ ذرا
نہیں ہے مردِ مسلماں اگر جلیل و جمیل

نویدِ فتح کہاں اب کہ تیرے ہاتھوں میں
نہ کوئی تیرِ ہدف ہے، نہ کوئی تیغِ اصیل

نہ مصطفٰے ، نہ مسیح و کلیم کے پیرو
یروشلم میں یہ آزردہ خواہشوں کے قتیل

خدا کا دین نہیں قیل و قال، جنگ و جدال
یہ ہے نیاز و گدازِ خلیل و اسمٰعیل

ہوئی ہے جس کی منادی زمیں پہ شام و سحر
میں سن رہا ہوں دمادم وہی صدائے رحیل

مرے ندیم ، یہ رستہ اسی دیار کا ہے
نگاہِ شوق نے دیکھا ہے پھر ہجومِ نخیل

﴿۲۲﴾

جلووں کی آرزو نہ تقاضا تھا طور کا
اب کیا گلہ ہو اُن سے دلِ ناصبور کا

فرصت ملے تو درد کا درماں ہے آج بھی
فصلِ بہار میں کوئی نغمہ طیور کا

کھلتا نہیں کہ بستۂ تقدیر ہے ابھی
یہ سلسلہ جہانِ غیاب و حضور کا

صوفی پہ کس لیے ہے گراں، جانتا ہوں میں
عقبٰی میں ذکر بادہ و غلمان و حور کا

مشکل تھا ، پھر بھی کر لیا ہم نے معاملہ
عقل و خرد سے مستی و شوق و سرور کا

انساں ، مگر حقیقتِ انساں سے بے خبر
حاصل یہی ہے وسعتِ علم و شعور کا

نغمہ سرا ہے بزم تو ایسی کوئی صدا
برپا ہو جس سے غلغلہ صبحِ نشور کا

طے کر لیا ہے نیمۂ شب کے سجود میں
ورنہ زمیں سے عرش کا رستہ تھا دور کا

﴿۲۳﴾

نوا پیرا ہوں شاید اس سے تیرا دل بدل جائے
مرے نغموں سے یہ آشفتۂ محمل بدل جائے
تری موجِ نفس میں وہ تلاطم چاہیے جس سے
یہ رسمِ اختلاطِ موجہ و ساحل بدل جائے
بڑی مشکل سے دو صدیوں کا اندازِ سفر بدلا
تمنّا تھی اگر چہ جادہ و منزل بدل جائے
مرے اشکوں نے سینچی ہے یہ کشتِ آرزو تیری
عجب کیا ہے اگر اس سے ترا حاصل بدل جائے
بھروسا چاہیے اُس پر کہ اُس کی پادشاہی میں
نہیں ممکن کہ آئینِ حق و باطل بدل جائے



چاہیے اب تو کوئی حرف شناسائی کا
راستہ کچھ تو کھلے گنبدِ مینائی کا

وادیِ علم نہیں ، دشتِ جنوں ہے شاید
رنگ لایا ہے فسوں رات کی تنہائی کا

دور جاتا بھی نہیں، لوٹ کے آتا بھی نہیں
طرفہ انداز ہے یہ بھی ترے ہرجائی کا

ماہ و انجم ہوں کہ یہ سرو و صنوبر تیرے
پیکرِ گل ہیں خیالات کی رعنائی کا

اسی امید پہ ہے خانقہوں کی رونق
ڈھونڈ لائیں گے شرر شعلۂ سینائی کا

کس لیے چاہوں؟ یہ دنیا کی ستائش کیا ہے!
منتظر ہوں تو فقط اُن کی پزیرائی کا

اپنی دہلیز بھی اب اُن کو عطا کر کہ جنھیں
تو نے بخشا ہے یہاں ذوق جبیں سائی کا

﴿۲۵﴾

مرے عزیز ، یہ انساں کا نشۂ ادراک
وہ زہرِ ناب ہے جس کا نہیں کوئی تریاک

خدا شناس ہو آدم تو مہر و مہ کے لیے
اسی کے نور سے لیتے ہیں روشنی افلاک

ورائے چرخ بھی رہتی تھی جستجو جس کی
ترے گلو میں کہاں اب وہ نالۂ بے باک

اسے نہ دیکھ کہ نخچیر تھے مہ و پرویں
اسے بھی دیکھ کہ خالی ہے اب ترا فتراک

ہوا بھی زور دکھاتی ہے رہ گزاروں میں
الجھ رہے ہوں اگر آگ سے خس و خاشاک

ترا یہ حال کہ اندیشۂ خرد بھی جنوں
اُدھر یہ بات کہ اُن کا جنوں بھی ہے چالاک

شبِ سجود اگر ذوقِ التفات بھی ہے
نگاہ چاہیے اس میں کوئی نگاہ سے پاک

﴿۲۶﴾

پھر ڈھونڈتا ہوں لولوے لالا سحاب میں
دیکھی ہے کس نے دولتِ دریا حباب میں؟

یہ ارتعاش کیا ہے مغنی کے ہاتھ میں
نغمہ الجھ گیا کوئی تارِ رباب میں

ہر روز ایک تازہ جہاں کی حکایتیں
اب رہ گئی ہیں قصۂ عہدِ شباب میں

لکھتا ہوں دل کی لوح پہ تقدیرِ کائنات
پڑھتا ہوں روز و شب اسے ام لکتاب میں

ہاں، دیکھیے ذرا کہ الٹ دی ہے پھر نقاب
حسنِ ازل نے آج شبِ ماہتاب میں

پائی نہ تھی یہاں کبھی رختِ سفر کے ساتھ
وہ لذتِ سفر کہ ملی ہے سراب میں

شاید ہوئی ہے پھر کسی محشر کی ابتدا
پھر شب کی تیرگی ہے مہ و آفتاب میں

اپنی ہی ذات سے ابھی واقف نہیں ہوں میں
رہتا ہے اپنی موج سے دریا حجاب میں

شعر و سخن کہاں، فقط اشکِ سحر کے ساتھ
حاضر ہوں پھر حضورِ رسالت مآب میں

﴿۲۷﴾

نہ وہ تیمور باقی ہے ، نہ وہ چنگیز باقی ہے
مگر اس رخشِ وحشت کو وہی مہمیز باقی ہے
ترے جلووں کا محشر قصۂ ماضی ہوا پھر بھی
مرے سینے میں کیوں اب تک یہ رستا خیز باقی ہے؟
وہ دن جاتے رہے، لیکن تری کافر اداؤں میں
ابھی شاید کوئی غمزہ جنوں آمیز باقی ہے!
پرانے مے کدوں میں ڈھونڈنے والوں کو ملتی تھی
مرے شیشے میں وہ صہبائے آتش خیز باقی ہے
بہت دست و گریباں ہو چکے سرمایہ و محنت
تری دنیا میں لیکن عشرتِ پرویز باقی ہے
اجازت ہو تو ساقی، تلخیِ ایام سے کہہ دوں
مرے ساغر میں اک جرعہ نشاط انگیز باقی ہے
خزاں میں نغمہ پردازوں نے سامانِ سفر باندھا
چمن میں اک یہی بلبل ترنم ریز باقی ہے

﴿۲۸﴾

سنے تو گرمِ سفر ہو نہ آسماں کے لیے
مرے گلو میں وہ نغمہ ہے سارباں کے لیے
سوادِ زہرہ و مریخ میں حیات کہاں؟
یہ سنگ وخشت ہیں اگلے کسی جہاں کے لیے
اگرچہ سینۂ آدم میں ہے مقام اس کا
تڑپ رہی ہے مگر اپنے آشیاں کے لیے
سنبھال کر اسے رکھوں کہ یہ دلِ ناداں
اک ارمغاں ہے خداوندِ مہرباں کے لیے
وہی چراغ کہ جلتی ہے آرزو جس میں
اندھیری شب ہے تو لایا ہوں کارواں کے لیے
ہوئی ہے سارے زمانے کی داستاں آخر
وہ ایک بات کہ تھی زیبِ داستاں کے لیے
روا نہیں ہے مسلماں کو خوے نومیدی
کہ سرد وگرمِ زمانہ ہیں امتحاں کے لیے
ترا کرم ہے کہ سجدوں کی جستجو میں رہے
دل و نگاہ ترے سنگِ آستاں کے لیے
عطا ہو اہلِ حرم کو کہ آشنا تھے کبھی
وہ ایک جرعہ کہ باقی تھا کشتگاں کے لیے

﴿۲۹﴾

جب دیکھتا ہوں شوخیِ رنگِ چمن کو میں
ہر گل میں دیکھتا ہوں ترے بانکپن کو میں

ہوتا ہے روز راہ کے کانٹوں سے تار تار
سیتا ہوں ان کی نوک سے پھر پیرہن کو میں

ہر شخص کو ہے بزم میں ظاہر سے التفات
باہم کروں کہاں ترے روح و بدن کو میں؟

عالم کو اپنے ذوق سے بے گانہ دیکھ کر
خلوت میں لے گیا ہوں تری انجمن کو میں

قلب و نظر ہیں ذوقِ تمنا سے بے نصیب
لاؤں کہاں سے اب ترے عہدِ کہن کو میں

اس دشتِ بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

رخشِ حیات ، دیکھیے جا کر تھمے کہاں
یزداں کو دیکھتا ہوں کبھی اہرمن کو میں

﴿۳۰﴾

یہ عالم نور ہے ، پنہاں نہ پیدا
تہِ دریا ہے گویا روے دریا
کسی کے درپئے آزار ہونا
نہیں یہ بندۂ مومن کو زیبا
میں صحرا سے نکل کر دیکھتا ہوں
وہی پھر سامنے ہوتا ہے صحرا
نہ محرم ہے ، نہ کوئی رازداں ہے
تری محفل سے جب نکلا ہوں ، تنہا
دلِ ناداں، وہ پہلی یاد اب بھی
اگرچہ ہے ، مگر کم کم ہویدا
یہ مے خانہ سلامت ہے تو ساقی
اِدھر بھی ایک دن پہنچے گی صہبا
جنوں کیا چیز ہے دنیا میں؟ یا رب
ہوا ہے عقل کو بھی جس کا سودا
یہاں کوئی اگر دیکھے تو ہر سو
قیامت ہر نفس رہتی ہے برپا
ندا پھر وادیِ فاراں سے آئی
ہوئے کیوں اجنبی زیتون و سینا؟
کوئی تیرے مسلماں کو بتائے
زمانہ دوش ہوتا ہے ، نہ فردا
اِدھر اے سارباں ، اِس راستے پر
نواحِ کاظمہ ، پھر سوے بطحا

﴿۳۱﴾

یہ نغمہ دردِ فرقت سے نوائے غم ہوا آخر
یہی فرقت کا رشتہ ، رشتۂ محکم ہوا آخر

مہ و انجم سے روشن تھا کبھی اپنا یہ میخانہ
وہ اس کا غلغلہ اب گریۂ پیہم ہوا آخر

یہی آدم ہوا ہے باعثِ تخلیقِ آدم بھی
یہ افسانہ بھی جزوِ قصۂ آدم ہوا آخر

سنا ہے اب کہیں ابلیس بھی صدیوں کی محنت سے
فرنگی بت گروں کے راز کا محرم ہوا آخر

صدا آئی یہ دینِ حق جب اترا آسمانوں سے
جہاں میں اختلاطِ شعلہ و شبنم ہوا آخر

یہی گھر تھے جہاں کچھ روحِ مشرق دیکھ لیتے تھے
یہ شیرازہ بھی اِس تہذیب میں برہم ہوا آخر

اسی دل سے فروزاں تھے زمین و آسماں لیکن
وہ ظلمت ہے کہ اس کا نور بھی مدھم ہوا آخر

ترے حرفِ عنایت سے میں بے گانہ رہا برسوں
مرے زخمِ جگر پر اب وہی مرہم ہوا آخر

تعجب ہے زمیں کو ، آسماں بھی محوِ حیرت ہے
وہ اک اُمی تھا ، لیکن سرورِ عالم ہوا آخر

﴿۳۲﴾

بندۂ صبح و شام ہے ساقی — یہ تمدن غلام ہے ساقی

دیکھتا ہوں تو سارا عالم ہی — مہ وشوں کا خرام ہے ساقی

نہ سہی ، حرفِ التفات سہی — مے کدہ تشنہ کام ہے ساقی

روز وشب، ماہ وسال تیرے ہیں — ہم فقیروں کا نام ہے ساقی

سر پہ رہتی نہ تھی ردا پہلے — اب حیا بھی حرام ہے ساقی

حق کی خاطر ہو آرزو جس کی — اس عمل کو دوام ہے ساقی

بر نہ آئے تو چھوڑ دی جائے — وہ تمنا ہی خام ہے ساقی

رات آتی ہے ، رہ نہیں جاتی — یہ سحر کا پیام ہے ساقی

ماہِ نو تھا سرائے میر میں جو
اب وہ ماہِ تمام ہے ساقی

﴿۳۳﴾

یہی زمین کرے گی پھر آسماں پیدا
اگر ہوں آج بھی ملت کے پاسباں پیدا

زمانہ اُس کو دگرگوں نہ کر سکے گا کبھی
کیا ہے علم نے کوئی اگر جہاں پیدا

غمیں نہ ہو کہ یہاں ہم سفر نہیں ملتے
کریں گے جادہ و منزل ہی کارواں پیدا

رہے ہیں جس سے فروزاں یہ منبر و محراب
ترے ضمیر سے ہوتی ہے وہ اذاں پیدا

یہی کمال ہے اپنا کہ اس زمانے میں
کیے ہیں عظمتِ رفتہ کے نغمہ خواں پیدا

مرے عزیز ، تماشا ہے خانقاہوں کا
وہ درد و سوز کہ ہوتا ہے ناگہاں پیدا

اسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے راز داں پیدا



دیارِ علم و محبت میں نام پیدا کر
اب اس جہاں میں بھی اپنا مقام پیدا کر
ترے لہو سے فروزاں ہو پیرہن جس کا
وہ ایک داغِ جگر ، لالہ فام پیدا کر
یہ دشت و در ہیں اگر لذتِ سفر کے لیے
تو کارواں میں کوئی تشنہ کام پیدا کر
نظر اٹھا کہ اِدھر بھی ہے بادۂ گلگوں
پھر اِس نگاہ سے مینا و جام پیدا کر
ترے حضور میں حرف و سخن کہاں ، ساقی
یہ میرے اشک ہیں، اِن سے کلام پیدا کر

﴿۳۵﴾

یہ زمانہ بھی کوئی دن تو مرے نام کرے
اب کسی اور کا رخ تلخیِ ایام کرے

جی میں آتا ہے کبھی پیرِ فلک سے کہہ دوں
آخری وقت ہے، وہ جائے اب آرام کرے

آرزو ہے کہ ترا فیض ہوا ہے جس پر
پھر ترا فیض زمانے میں وہی عام کرے

آپ دیتا ہے وہی آپ خریدار بھی ہے
کوئی بازار میں آئے تو ذرا دام کرے

صبحِ خنداں پہ ہے، لاریب مسلماں کا بھی حق
ہاں ، مگر اِس کا تقاضا نہ سرِ شام کرے

جلوۂ حسن زمیں ہے تو فلک نغمہ سرا
ساقیا ، اب تو کبھی رقص ترا جام کرے

سبزۂ نورس

بچے کی دعا

اٹھاتا ہوں پھر ہاتھ لب پر دعا ہے
مرے ننھے منے سے دل کی صدا ہے
مجھے ایک شمعِ ہدایت بنا دے
زمانے پہ اپنی عنایت بنا دے
مرے امی ابا کو راحت ہو مجھ سے
مرے بھائی بہنوں کو چاہت ہو مجھ سے
میں دیکھوں جب ان کو تو خورسند دیکھوں
اُنھیں ہر قدم پر رضا مند دیکھوں
بڑا ہوں تو اِن سب کی خدمت کروں میں
مرے آقا، تیری عبادت کروں میں
غریبوں کا ہمدرد بن کر رہوں میں
ضعیفوں کو تکلیف ہو تو سہوں میں
تجھے یاد کرتا رہوں زندگی بھر
تجھی سے میں ڈرتا رہوں زندگی بھر
جہاں میں ترے گیت گاتا رہوں میں
ترے دین کے کام آتا رہوں میں
اگر ہو تو نیکی سے الفت ہو مجھ کو
برائی سے ہو گر عداوت ہو مجھ کو
مجھے رات دن شکر کرنا سکھا دے
ہر اندوہ میں صبر کرنا سکھا دے
بہارِ وطن ہو مری زندگانی
رہوں اس میں جنت کی بن کر نشانی
خدایا، میں خوابوں کو سچ کر دکھاؤں
زمیں پر نئی ایک دنیا بناؤں

صبحِ بہاراں

صبحِ بہاراں ، صبحِ بہاراں
اس میں کم کم موسمِ باراں

بستی بستی ، گاؤں گاؤں
پھیل رہی ہے ابر کی چھاؤں

دور پپیہا بول رہا ہے
کانوں میں رس گھول رہا ہے

آؤ بچو، سیر کو جائیں
من کے کھیت میں پھول کھلائیں

چڑیا گانا گاتی دیکھیں
بلبل راگ سناتی دیکھیں

باغ میں کلیاں کھلتی دیکھیں
جھوم کے ہر سو ہلتی دیکھیں

اودی اودی ، نیلی نیلی
سرخ ، گلابی ، پیلی پیلی

اپنے رنگ بدلتی دیکھیں
تصویروں میں ڈھلتی دیکھیں

پتی پتی پر گل کاری
جیسے بنّو کی عماری

اِس کے ہاتھ میں ایک کٹورا
صبح کی صورت گورا گورا

وہ یاقوت کا ایک پیالہ
اُس پر گنگا جمنی ہالہ

رنگ برنگ کے صافے باندھے
ڈالی ڈالی نافے باندھے

اٹھتے ، جھکتے ، پھر شرماتے
اپنے رنگوں میں چھپ جاتے

دیکھ رہے ہو گوناگوں ہیں
قدرت کا یہ ایک فسوں ہیں

آؤ، ان میں بیٹھ کے گائیں
خوب سنیں اور خوب سنائیں

اُس خالق کے گیت سہانے
ہم کو جس کی ایک ادا نے

بخشی ہے یہ دنیا ساری
آبی ، خاکی ، نوری ، ناری

یہ سب سائنس دان سیانے
چھوڑ کے اپنے عذر بہانے

دیکھیں اب تو اُس کی شانیں
اب تو یہ اُس کو پہچانیں

جنید کے نام

ترے سامنے یہ زمیں آسماں   خداوندِ عالم کا سارا جہاں

یہ تاروں کے چلتے ہوئے کارواں   یہ رستے بدلتی ہوئی کہکشاں

یہ سورج سروں پر چمکتا ہوا   یہ راتوں میں چندا دمکتا ہوا

عجب مرحلوں سے گزرتا ہوا   نئے سے نیا روپ بھرتا ہوا

افق پر سرِ شام سونے کے ڈھیر   اڑا کر جنھیں رات دیتی ہے پھیر

فضا ابر کے بعد نکھری ہوئی   دھنک اس کے دامن پہ بکھری ہوئی

یہ بجلی ، یہ کڑکا، یہ بارش کا زور   یہ جنگل میں اس کے برسنے کا شور

زمیں پر کھڑے کوہساروں کی شان   ہمالہ کی ، الوند کی آن بان

یہ گرتی ہوئی آبشاروں کے گیت   یہ اڑتے ہوئے سنگ پاروں کے گیت

ہوائیں بہت نرم چلتی ہوئی   بپھرتی ہوئی ، کچھ سنبھلتی ہوئی

چٹانوں سے برفاب بہتا ہوا   ستم رہ گزاروں کے سہتا ہوا

یہ وادی میں پھر اس کا حسنِ خرام   درختوں کا جھک جھک کے اس کو سلام

سمندر کے سینے میں لہروں کا جوش   اڑاتا ہے سہراب و رستم کے ہوش

حسیں وادیاں ، یہ حسیں مرغزار   یہ حدِ نظر تک شجر بے شمار

مہکتے ہوئے پھول ہر رنگ میں   پرندے چہکتے ہر آہنگ میں

یہ حسنِ فراواں کہ ہے سنگ میں   کبھی موقلم میں ، کبھی چنگ میں

کبھی لفظ و معنی کے اسرار میں   کبھی علم و حکمت کے اظہار میں

کبھی دل کے جذبوں کی تعبیر میں   کبھی اینٹ پتھر کی تعمیر میں

یہ آنکھیں، یہ چہرے، یہ رنگیں لباس   یہ پیکر کہ ہے جن میں پھولوں کی باس

یہ لہجوں میں حرف و صدا کا سفر   ہر انداز کا ، ہر ادا کا سفر

ہواؤں میں اڑتے ہوئے راہوار   خلا میں ٹہلتے ہوئے شہ سوار

یہ امی ، یہ ابا ، یہ بھائی بہن   یہ شہروں کی رونق، یہ دولت، یہ دھن

لبھاتا ہے دل کو یہ سب ، اے پسر   الجھتی ہے رہ رہ کے اس میں نظر

بہت خوب صورت ، بہت دل نواز   بجا ہے کہ خالق کو ہو اس پہ ناز

تم اس میں رہو، اس میں آگے بڑھو   ترقی کی سب منزلیں طے کرو

تمھیں روز و شب یہ مبارک رہے   ملا ہے تو اب یہ مبارک رہے

ہمیشہ مگر ہو یہ مدِ نظر   کہ ہے زندگانی یہاں اک سفر

تمھیں ایک دن اس سے جانا بھی ہے   اِسے دے کے کچھ اور پانا بھی ہے

وہ جو کچھ ہے اِس سے کہیں بڑھ کے ہے   نہیں اُس کے پاسنگ بھی کوئی شے

حقیقت ہے وہ ، یہ متاعِ غرور   وہ آنکھوں کی ٹھنڈک، وہ دل کا سرور

مری جان ، اُس کو بھلانا نہیں

اُسے کھو کے دنیا کو پانا نہیں

مریم کے نام

تو مری جان ، زمانے میں سنبھل کے رہنا
اس میں رہنے کے برے ڈھنگ بدل کے رہنا
جب بھی دیکھے کہ دگرگوں ہے یہ دنیا تیری
ہو فقط صلح کی تدبیر تمنا تیری
گھر کے آنگن ہی میں دیکھوں مہِ تاباں تجھ کو
زیب و زینت کی نمائش نہ ہو شایاں تجھ کو
تجھ کو جینا بھی ہے ، مرنا بھی مسلماں ہو کر
درد مندوں کے لیے درد کا درماں ہو کر
نرم خوئی ہو ہر اک کام میں عادت تیری
علم و اخلاق کی دولت ہو سعادت تیری
اپنے اوقات کو ہرگز نہ پریشاں رکھنا
حسنِ تدبیر کو ہر شے میں نمایاں رکھنا
میں ترے گھر میں پرندوں کو چہکتے دیکھوں
تیری آغوش میں پھولوں کو مہکتے دیکھوں

ایک کہانی

یہ ہے بچو ، ایک کہانی میٹھی ، تازہ اور پرانی
ابراہیم ، جنید اور مریم تینوں بیٹھے تھے کچھ برہم
میں نے پوچھا: بات یہ کیا ہے! چہروں پر برسات یہ کیا ہے!
روتے روتے رک کر بولے ہم بیٹھے تھے بستہ کھولے
اِس نے میری گیند اٹھا لی اِس نے لے کر ٹافی کھالی
مجھ کو یہ امی نے دی تھی میں نے یہ بازار سے لی تھی
اِس کا بلا اب میں لوں گا اِس کی گڑیا میں چھینوں گا
مریم بھی کیوں پیچھے رہتی اپنی گڑیا کا غم سہتی
اٹھی، جھپٹی، چیخ کے بولی تب ماروں گی تم کو گولی
اِس کو ہاتھ لگا کر دیکھو اِس کے پاس تو جا کر دیکھو
ٹھیرو، ٹھیرو، چپ ہو جاؤ لڑنا بھڑنا چھوڑ کے آؤ
تم نے بلوں کو دیکھا ہے بلی بلوں کو دیکھا ہے
چھینا جھپٹی اُن کو بھائے لپاڈگی بھی خوش آئے
تم تو آدم زاد ہو، بچو حوا کی اولاد ہو، بچو
عقل سے بہرہ یاب ہوئے ہو علم سے عالم تاب ہوئے ہو
آؤ یہ سب باتیں چھوڑیں شیطانوں سے رشتہ توڑیں

اپنے رب سے لینا سیکھیں
باقی سب کو دینا سیکھیں

الڑّ بلڑّ

ایک تھا لڑکا موٹا ، لدھڑ نام تھا اُس کا لال بجھکڑ

پڑھنا لکھنا پاس نہ پھٹکے کچھ پوچھو تو ایک بھلکڑ

آنا جانا گھر میں اُس کا جیسے آندھی ، جیسے جھکڑ

یہ دروازہ ، وہ دروازہ پیٹ رہا ہے سب کو دھڑ دھڑ

گھر میں ہو تو ہر کونے میں کھٹ کھٹ،کھٹ کھٹ،کھڑ کھڑ،کھڑ کھڑ

مٹکا توڑے ، چھاگل اُلٹے سارے میں کر ڈالے کیچڑ

گھر سے نکلے ، باہر جائے پڑ جاتی ہے ہر سُو بھاگڑ

ہر کوچے میں بھاگ رہا ہے بانس پہ اپنے باندھے جھانکڑ

بات کرو تو مُنہ پر گالی ایسا لاغی ، ایسا پھکڑ

ہم نے اُس کی ماں سے پوچھا آپ نے دیکھا اِس کا ہلڑ

اٹھ کر بیٹھی ناز سے بولی اے لو ، اُس کا الڑ بلڑ

اِس کو تم ہلڑ کہتے ہو گویا اک تتلی کو مکڑ

ماؤں کی یہ بات ہے بچو

جس سے پھر ہوتی ہے گڑبڑ